انیسویں صدی میں فنِ تاریخ گوئی اور فرہنگِ تاریخ گوئی

(فن، روایت اور ارتقا)

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام ☆

Abstract

Art of Chronogram in 19th Century

Composing of Chronogram (*Tareekh Goi*) is a scientific skill based on numerical value,which has been determined by its masters as an art. Like a true historian, its aim is to give a true picture of the incident, past and present, through an alphabet, a word, a sentence, a Quranic verse, a Hadith or still a single line. The value of numbers has been in vogue in the East and West through ages.The practice of using letters for numbers, is the basis of Abjad (also called Jumal) used in composing chronograms.

A lot of chronogramic verses were composed in the 18th century. The climax of this art was seen in 19th century in the Sub-continent especially in the northern and southern India.It was so popular that almost every poet at that time was not only well-versed in it but

☆ صدر شعبہء اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، سول لائنز، ملتان۔

also composed it in Persian, Arabic, and Urdu languages to prove his poetic excellence.The poets who were proficient in poetry but weak in composing chronograms, their ability in this particular skill was taken doubtful.

The climax of this art goes to the glossaries edited by the poets (Tarekh go shoara)in the 19th century. Many glossaries were published after the War of Independence 1857 in the subcontinent. These glossaries proved very beneficial to the poets (Tarekh go shoara)of 19th century. With the help of these glossaries, experts as well as the poets composed chronograms.These glossaries were published almost during the second half of the 19th century. These glossaries are more than a dozen. A number of glossaries could not even be published. This article is a comprehensive and elaborative study of the glossaries of the words edited in 19th century to be used in chronograms.

Key words: *Art of Chronogram - Tareekh Goi.*

کسی واقعہ کے تاریخی وقوع کو الفاظ میں اس طرح بیان کرنا کہ ان الفاظ کے حروف کے متعینہ اعداد سے مطلوبہ واقعہ کا سالِ وقوع ظاہر ہو، اصطلاحاً اسے تاریخ کہتے ہیں اور یہ عمل تاریخ گوئی کہلاتا ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں حروف اعداد کی قیمت متعین کرتے ہیں اور اس فن کا ماہر حروف یا الفاظ کی مدد سے لمحاتِ گریزاں کو اس انداز میں نقش دوام عطا کرتا ہے کہ فقط وہ ایک سالِ مطلوب ہی نہیں رہتا بلکہ ایک گہری تہذیبی معنویت کا حامل بھی بن جاتا ہے۔ ممکن ہے آج اس فن کو فعلِ عبث اور وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہو لیکن ایک وقت وہ بھی تھا جب ایک اچھے تاریخ گو کو بڑی قدر و منزلت حاصل ہوتی تھی اور معاشرے میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کہنہ مشق اور استاد شاعر کے لیے اس فن سے کما حقہ واقفیت ضروری سمجھی جاتی تھی بلکہ پیش آمدہ مسائل میں اس سے رائے طلب بھی کی جاتی تھی۔ بسا اوقات کہنہ مشق استاد شاعر کا فیصلہ اپنے مؤقف کو تقویت پہنچانے کے لیے لیا جاتا تھا۔[۱]

اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے فطری ذہانت، خداداد صلاحیت، ذہنِ رسا، علم ریاضی میں خاطر خواہ قابلیت، مسلسل مشق اور شب و روز کا ریاض درکار ہوتا تھا۔ تاریخ گوئی کسی بھی شخص کی استادی، طباعی، ذہانت، علم و فضل اور کاوشِ فکر کا ایسا امتحان ہوتا تھا جس میں کامیابی کا سہرا کسی کسی کے سر بندھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بحرِ بیکراں میں ماہر پیراک حوصلہ ہارتے اور اس

صحرائے بسیط میں بڑے بڑے خضر راہ گم کرتے نظر آتے ہیں لیکن ایسے مشاق شعرا کی، کسی بھی دور میں کمی نہیں رہی (حتیٰ کہ آج کے دور میں کہ جب اسے وقت کا ضیاع تصور کرنے والوں کی بھی کمی نہیں) جن کے ہاتھوں میں یہ فن ہنروری کے اعلیٰ نمونوں میں ڈھل کر معجزانہ خلاّقی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ادھر کوئی واقعہ رونما ہوا، ادھر اس کی تاریخ کہہ دی۔ مسلسل مشق اور شب و روز کے ریاض کے باعث کچھ تاریخ گو شعرا نے اس فن پر اس حد تک گرفت حاصل کر لی تھی کہ گفتگو بھی تاریخی کرتے۔ یہ ان تاریخ گو شعرا کی قابلیت اور استادی کا عملی اظہار تھا۔ منشی فدا علی فارغ عموماً گفتگو کرتے تو تاریخی جملے بولتے۔ ایک مرتبہ محکمہء مدار المہامی میں دو گھنٹے تک گفتگو تاریخی کرتے رہے اور سوال و جواب بھی تاریخی جملوں میں ادا کرتے رہے۔ [۲]

انیسویں صدی عیسوی میں شمالی ہند ایک ایسے خطہء زمین کا نقشہ پیش کرتا تھا جہاں تاریخ گوئی نے ایک فیشن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شاعر کے لیے لازمی تھا کہ وہ تاریخ گو بھی ہو۔ اگر کوئی شاعر تاریخ نہ کہہ سکتا ہو تو اس کی شاعرانہ صلاحیت مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ [۳] اس عہد میں تاریخ گوئی کا شوق فراواں شمالی ہند کے تہذیبی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ فن ہندوستان میں بالعموم اور شمالی ہند میں بالخصوص تہذیب کی علامتوں میں سے ایک علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس صدی میں شاعری کا جوہر اسی فن میں کھلتا تھا۔ خوبصورت تاریخ کہنا اور برمحل مادہء تاریخ نکالنا مشاق تاریخ گو کی قابلیت کا امتحان ہوتا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف اول تک دربار داری عام ہونے کی وجہ سے تاریخ گوئی زیادہ تر خواص تک محدود تھی۔ اکثر تاریخیں نواب، امرا، وزرا اور ارا کین سلطنت کی یا ان سے متعلق ہوتی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دربار داری کا خاتمہ ہو گیا تو تاریخ گوئی کے لیے یہ لمحہ نیک شگون ثابت ہوا اب تاریخ گوئی خواص سے منتقل ہو کر عوام کے ہاتھوں تک پہنچ گئی۔ تاریخ گوئی کے عوامی ہونے کے بہت سے اسباب ہیں ان میں ایک بڑا سبب دربار داری کا خاتمہ بنا اور دوسرا تاریخی الفاظ کی فرہنگوں کا منظر عام پر آنا تھا۔ ان فرہنگوں کے مرتبوں نے انھیں لغات لکھا ہے لیکن چونکہ اس عہد میں لغت اور فرہنگ کی اصطلاحوں میں فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا اس لیے ان کو لغات کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ اب جب کہ جدید لسانیات نے لغات اور فرہنگوں کو اپنی اپنی خصوصیات کی بنا پر علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس لیے اس مقالے میں بھی انھیں فرہنگوں کے نام سے موسوم کیا جائے گا البتہ ان فرہنگ نویسوں نے اپنی فرہنگوں میں چونکہ انھیں لغت کے نام سے موسوم کیا ہے اس لیے ان کے بیانات کو نقل کرنے میں انھیں بعینہٖ نقل کیا گیا ہے۔ لغات کا دائرہ فرہنگ سے وسیع ہوتا ہے اور وہ کثیر الجہت ہوتی ہے جب کہ فرہنگ محدود معنی کی حامل ہوتی ہے۔ اردو کی جتنی بھی فرہنگیں لکھی گئی ہیں ان کا دائرہ بھی صرف ایک سطح تک محدود تھا۔ اس لیے انھیں فرہنگ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی میں شاعری اس درجہ مروج اور عام ہو گئی تھی کہ اعلیٰ سوسائٹی میں داخل ہونے اور اس میں عزت و افتخار کا سب سے بڑا وسیلہ شاعری کا نظر آتا ہے۔ اس عہد میں شاعری کی مقبولیت کا اندازہ محمد حسین آزاد کی اس رائے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''گھر گھر شاعری کا چرچا ہے جس امیر اور جس شریف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے۔'' [۴] شاعری ذریعہ عزت تو تھی ہی، نوابین و امرا سے تقرب کا وسیلہ بھی تھی۔ کسی شخص کے لیے شاعر ہونا افتخار کا باعث تھا لیکن تاریخ گو شاعر ہونا اس سے بھی بڑے اعزاز کی بات تھی۔ نظم طباطبائی، مالک الدولہ صولت کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''مرحوم کو تاریخ کی بڑی مشق تھی۔ ناسخ کے تتبع میں

ان کے تمام شاگردوں نے تاریخ کو صنائع شعریہ میں شمار کیا تھا۔ شاعر کا تاریخ گو ہونا لازم سمجھتے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں مٹیا برج سے میں لکھنو آیا تو یہاں دیکھا کہ اکثر شاعروں نے اس کا التزام کرلیا ہے کہ ہر غزل کے مقطع میں تاریخ ضرور ہو۔ انھیں دنوں میں ایک طرح ہوئی تھی 'جواب اچھی طرح، حساب اچھی طرح' میں اس مشاعرہ میں شریک تھا۔ اپنے ایک مہربان حکیم مرزا فدا احمد صاحب دانش کا تاریخی مصرعہ جو حروف معجمہ میں ہے مجھے اب تک یاد ہے۔ 'مجتمع سب لوگ صحبت انتخاب اچھی طرح'' ۵

مندرجہ بالا بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہر چھوٹا بڑا شاعر تاریخ کہنے میں منہمک ہے اور جو شاعر اس فن پر قدرت نہیں رکھتا تھا یا حسابی مشق کے جھنجھٹ سے بچنا چاہتا تھا اسے کسی تاریخ گو شاعر کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ غالب جیسا تخلیقی نابغہ اور قادرالکلام شاعر بھی غالباً اسے غیر تخلیقی عمل سمجھتے ہوئے سخت ناپسند کرتا تھا لیکن بعض مجبوریوں کے تحت انھیں کچھ تاریخیں کہنا بھی پڑیں چونکہ ان کا ذہن حسابی مشق اور ہندسوں کے توڑ جوڑ سے گھبراتا تھا اس لیے اسے وہ منشیانہ عمل سمجھتے ہوئے دوسرے درجے کی تخلیق سمجھتے ہوئے تاریخ کہنے کی جھنجھٹ یا کھکھیڑ سے دور بھاگتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی ان سے تاریخ کہنے کی فرمائش ہرگز نہ کرے اور اگر کوئی ان سے تاریخ کہنے کی درخواست کرتا تو اسے خوبصورتی سے ٹال دیتے اور ایسا عذر پیش کرتے کہ طالبِ تاریخ اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا اور اپنی درخواست واپس لینے پر مجبور ہو جاتا۔ ۶

تاریخ نہ کہنے کے لیے اگر انھیں جھوٹ بھی بولنا پڑتا تو گریز نہ کرتے۔ سیاح کے نام خط میں انھوں نے تاریخ گوئی کی صلاحیت سے صاف انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''بھائی تمھاری جان کی قسم اور اپنے ایمان کی قسم، میں فن تاریخ گوئی اور معما سے بیگانہ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اور کا ہے، اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ ڈھونڈھ دیتے، موزوں میں کرتا'' ۷

انیسویں صدی کے آغاز تک تاریخ گو شعرا اپنی کاوشِ فکر اور حسابی قابلیت کے زور پر تاریخ کہہ لیا کرتے تھے۔ اس صدی میں صورت حال یہ اختیار کر چکی تھی کہ صرف شاعر ہونے سے کام نہیں چلتا تھا۔ تخلیقی جوہر کے ساتھ ساتھ اس حسابی ذہن کی ضرورت بھی ہوتی تھی جو تاریخ کہنے میں مدد و معاون ہو۔ تاریخ گوئی کی صلاحیت اور اور اس میں مہارت ہی وہ خوبی اور صلاحیت تھی جو چھوٹے، بڑے، اہم اور غیر اہم شاعر میں تمیز اور انفرادیت کا باعث بنتی تھی۔ اس عہد میں یک فنا ہونا (کسی ایک ہی صنف پر قدرت رکھنا یا ایک ہی صنف میں شعر کہنا) معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہر شاعر کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اصناف میں شعر کہے تاکہ اس کی قادرالکلامی اور مشاقی پر مہر تصدیق ثبت ہو سکے۔ اس دور میں وہ شاعر جو شعر تو کہہ سکتا تھا لیکن تاریخ کہہ سکنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتا تھا اس کی شاعرانہ صلاحیت مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ گویا شاعری اور تاریخ لازم و ملزوم بن گئی تھی۔ الطاف حسین حالی نے دیوانِ حالی کے آخر میں قطعات تاریخ سے قبل ایک خوبصورت بات تحریر کی ہے۔ جو مذکورہ بالا خیالات کی عکاس بھی ہے اور اس عہد کی ادبی صورتِ حال کو بھی پیش کرتی ہے۔

''ایک بزرگ کے پاس لوگ اکثر تعویذ گنڈے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ عباسیوں کے عہد میں

ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ لوگ ایک قفل کو بند کر کے اس کے پاس لے گئے کہ اگر تو فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہے تو یہ قفل بغیر کنجی کے کھول دے۔ اس نے کہا، بھائی! میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، آہن گری کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کا مطلب اس نقل سے یہ تھا کہ ہم نے خدا کی طلب میں درویشی اختیار کی تھی یہ معلوم نہ تھا کہ عامل اور سیانا بھی بننا پڑے گا۔ یہی حال ہمارے ملک میں ان لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں وہ اور تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی ان سے اس وقت متعلق ہو جاتی ہے جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ مثلاً کسی کے اصطبل کی مرمت ہوئی یا گھوڑا اختہ کیا گیا یا کسی کی مینا مرگئی یا مرغ پالی جیتا یا بلی نے بچے دیئے ایسے وقت میں شعرا کو مقابلہ کے امتحان کا موقع مل جاتا ہے۔ جو شخص مادۂ تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمائش کے نزدیک سب سے اچھا نکال لاتا اس کا فی الجملہ اعتبار بڑھ جاتا ہے۔''۸

اس لیے ہر شاعر کو تاریخ کہنا پڑتی تھی خواہ وہ تاریخ دوسرے تاریخ گو سے کہلوا کر اپنے نام منسوب کر لے یا مادہ ءتاریخ کسی تاریخ گو سے موزوں کروائے اور باقی مصرعے خود نظم کر لے۔ یہ ایسا امتحان تھا جس سے ہر شاعر کو گزرنا پڑتا تھا۔ غالب بھی بادلِ نخواستہ اس امتحان سے گزرے۔ اس عہد میں تاریخ کہنے کا مرض اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ بات بات پر تاریخ کہی جاتی تھی۔ کوئی بھی واقعہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اس عہد میں تاریخ کی سان پر چڑھنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

شعرا کو تاریخ کہنے کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ تاریخ کہنے کے لیے اہم و غیر اہم واقعات تلاش کیے جاتے۔ دوست، عزیز، احباب میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو پہلے سے اس کی تاریخ وفات کا مادہ ڈھونڈھ لیا جاتا کہ عین وقت پر مادہ ءتاریخ ہاتھ نہ آیا تو پھر کیا کریں گے اور جب مذکورہ شخص کی وفات نہ ہوتی تو کفِ افسوس ملتے کہ ان کا تلاش کیا ہوا مادہ ءتاریخ ضائع ہو گیا اور ان کی محنت وصول نہ ہو سکی، گویا تاریخ کہنے کے لیے ایسی سان کی ضرورت ہوتی تھی جس پر اپنے اوزاروں کو صیقل کر سکیں، چنانچہ تاریخ کہنے کے لیے شعرا اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے اور جو بھی واقعہ رونما ہوا ہوتا اس کی تاریخ کہتے۔

کسی بڑے شاعر، عزیز، دوست احباب میں سے کسی کے فوت ہونے کی خبر ملتی تو تاریخ کہنے کی سبقت میں اس واقعے کی تصدیق بھی نہ کی جاتی اور تاریخ کہہ کر مشہور کر دی جاتی۔ داغ کی زندگی کے آخری سال حیدر آباد دکن میں گزرے۔ وہ جگت استاد تھے۔ برصغیر کا کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جہاں ان کے شاگرد موجود نہ ہوں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ مزید یہ کہ شہرت بھی خوب پائی تھی۔ اس لیے ان سے متعلق ہر واقعہ تاریخ گو شعرا کے لیے نہایت اہم اور تاریخ کے لیے کارآمد سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے بہت سے تاریخ گو جن میں ان کے شاگرد بھی شامل تھے اس انتظار میں رہتے تھے کہ ان سے متعلق کسی بات کا علم ہو اور وہ سب سے پہلے تاریخ کہیں۔ نومشق تاریخ گو شعرا کے لیے ان کی تاریخ کہنا شہرت اور ناموری کا باعث تھا اور شاگردوں کے لیے حقِ شاگردی ادا کرنا لازم تھا۔

داغ دہلوی آخری عمر میں اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے مرنے کی غلط خبر عوام میں پھیل گئی تو شعرا نے بغیر تصدیق کیے ان کی وفات کی تاریخیں کہہ ڈالیں اور اخباروں میں چھپوا دیں۔ ایسا ایک آدھ بار نہیں تین چار بار ہوا۔۹ احسن مارہروی 'انشائے داغ' میں لکھتے ہیں ''مرزا اکثر علیل رہا کرتے تھے اسی سلسلے میں ان کے انتقال کی جھوٹی خبریں شائع ہو جاتی

تھیں۔۱۸۹۵ء میں بھی ایسی ہی افواہ اڑادی گئی اور وہ اخباروں میں شائع ہوگئی اور قطعات تاریخ بھی چھپنے لگے۔جس کی تردید خود مرزا صاحب نے اخباروں میں کی۔اور بعض شاگردوں کو بھی لکھا'' ۱۰ خود داغ نے مشرف یار خان شرف کو ایک خط میں لکھا۔''برس دن تک ایسا بیمار رہا کہ خبر مرگ اخبار میں چھپی۔مرثیے،تاریخیں لوگوں نے کہیں،تم نے بات بھی نہ پوچھی۔'' ۱۱

اس عہد میں شعرا پر تاریخ گوئی کا خبط اس حد تک سوار ہو چکا تھا کہ دن رات اسی عمل میں منہمک رہتے۔بات بات پر تاریخ کہتے،گویا یہ ایک لت تھی جس کی تشفی کے لیے تاریخیں کہی جاتیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس عہد میں انتہائی غیر اہم اور معمولی معمولی واقعات کی کہی گئی بے شمار تاریخیں نظر آتی ہیں،کسی کی گھڑی گم ہوگئی،کوئی برتن ٹوٹ گیا،کسی کو بخار ہوا،کسی کو مچھر نے کاٹ لیا،کوئی بیمار ہوا،صحت یابی پائی،غسل صحت کیا،کوئی گر پڑا،کسی کے گھر موذی جانور نکلا،کوئی بچہ گم ہوگیا،کسی نے داڑھی رکھ لی یا منڈوا دی،علاج شروع کیا،پرہیز توڑ دیا،کسی کو کوئی کھانا پسند آیا،کوئی مکان بنا،کسی کا عقیقہ ہوا،ختنہ ہوا،بسم اللہ ہوئی،بچہ مکتب میں بٹھایا،کسی کے گھر میلاد ہوا،غرض کوئی بھی واقعہ ہو،شعرا تاریخیں کہتے،یہ ایک ایسی لت تھی جس کی تشفی کے لیے بات بات پر تاریخ کہی جاتی۔معلّٰی خیر آبادی کے دوست سبحان علی خان کا ورزش کے دوران دانت ٹوٹ گیا تو انھوں نے اس کی فی البدیہہ تاریخ کہی

دست سبحان خاں سے ورزش میں منہ پہ مگدر جو ان کے چھوٹ گیا
دانت ٹٹتے ہی یوں معلّٰی نے کہا کہی تاریخ 'دانت ٹوٹ گیا'
۱۲۹۲ھ ۱۲

کسی کا طوطا مر گیا تو تاریخ کہی گئی۔

میاں مٹھو جو ذاکرِ حق تھے رات دن نام حق رٹا کرتے
چونچ میں داب کے سر کلھیا کچھ نہ بولے سوائے ٹیں ٹیں کے ۱۳

نواب سید احمد علی خاں کا پالتو بٹیر مر گیا وہ بٹیر انھیں بہت پسند تھا۔اس پر نواب کو بہت دکھ ہوا۔ان کے درباری شاعر میر ملھو صنعت نے ان کے غم میں شریک ہونے اور اس کی یادگار کے طور پر بٹیر کا تاریخی نوحہ مخمس میں لکھا۔دو بند نقل کیے جاتے ہیں۔

دل سے نکلتی ہے مرے درد سے اس کے غم میں آہ کھانچہ سے تن کے ہو خفا ہائے بغیر اشتباہ
ہفتہ کے روز لی وہیں ملک بقا کی اس نے راہ غرّہ دویم ربیع اور بوقت چاشت گاہ
دارِ فنا سے کیا کہوں حیف وہ اڑ گیا بٹیر
آنکھوں کے میرے سامنے ہائے وہ اڑ گیا تو پھر جانے سے اس کے آہ آہ دل پہ قلق ہوا تو پھر
دل کو تشفی دی تو میں اور قلق گھٹا تو پھر سال وفات اس کا جب دل سے طلب کیا تو پھر
آئی ندا یہ طالبا آہ بٹیر وا بٹیر ۱۴
۱۲۳۷ھ

بات بات پر تاریخ کہنے کا چسکا شعرا کو ایسا لگ گیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے،سوتے جاگتے مادۂ تاریخ ہی بھائی

دیتا، حتیٰ کہ خواب میں بھی انھیں تاریخیں ہی نظر آتیں۔ منیر شکوہ آبادی کو نواب معین الدولہ باقر علی خاں ظفر جنگ کی تاریخ وفات کا مادہ خواب ہی میں ہاتھ لگا۔ تاریخ یہ ہے۔

خلف معتمد الدولہ معین الدولہ	نام باقر علی و خاں و ظفر جنگ خطاب
صاحب علم و سخن سنج و تخلص ساحر	نظم تو نظم نہیں نثر کا بھی ان کے جواب
فارسی گویوں میں تھے اہل زباں کی مانند	قدردان علما مجمع علم و آداب
شاعر و زائر و دیندار و امیر نامی	حصر اوصاف فضائل کو ہے درکار کتاب
آج دنیا سے گئے سوے عدم وا اسفاہ	کانپور آتش اندوہ سے ہے سینہ کباب
بخش دے آلِ محمد کے طفیل ان کو خدا	عیش وعشرت سے رہیں خلد میں تارو حساب
خواب میں ہاتھ لگا مصرع تاریخ منیر	وارو گلشنِ فردوس گرامی نواب ۱۵ھ ۱۲۹۱ھ

خواب میں دوسروں کے مادہ ءتاریخ ہی نظر نہیں آتے۔ اپنے حالات وواقعات سے متعلق مادہ ءتاریخ بھی تلاش کر لیے جاتے۔ تاسف نے اپنی وفات کی تاریخ خواب ہی میں لوحِ مزار پر کندہ دیکھی تھی۔ تاسف نے یہ تاریخ رقم کرنے سے پہلے یہ عنوان درج کیا پھر تاریخ درج کی۔ ''قطعہ در تاریخ وفاتِ خود کہ مصرعہ مادّہ بعینہٖ بر لوحِ مزارِ خویش کندہ مشاہدہ نمودم در خواب'' ۱۶ احمد حسین سحر نے رنگین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''از غرائب ایں کہ قبل یک سال از انتقال خودمی گفت کہ دریں سال رخت سفر بہ عدم آباد می کشم، چوں سبب پرسید گفت کہ سالہا است کہ بے خواست مصرعہ تاریخ فوت خود بر زبان جاریست کہ از مرگِ من در سالِ آیندہ خبری وہد و آخر ہمچناں اتفاق افتاد'' ۱۷

ڈاکٹر شبیہہ الحسن نے اس عہد کے مزاج پر بڑے اختصار اور جامعیت سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اگر ہم ایسے معاشرے کا تصور کریں جیسا کہ انیسویں صدی میں موجود تھا کہ جس میں شاہی حکومت قائم ہو، امرا ورؤسا کا مجمع ہو اور ان کے متوسلین میں بکثرت شاعر بھی ہوں تو ظاہر ہے ان گھرانوں میں نمودار ہونے والا ہر چھوٹا واقعہ بھی اتنی اہمیت اختیار کر سکتا ہے کہ اس کے لیے تاریخ کہنے کا جواز پیدا ہو جائے۔ اس ماحول میں گوشہ نشین شعرا جو گرد وپیش کے علائق سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں فطرتاً تاریخ گوئی کی طرف مائل نہیں ہوں گے لیکن وہ شعرا جن کے سماجی حدود بہت پھیلے ہوئے ہوں اور حلقہ تعارف وخصوصیات وسیع ہو اور بالخصوص سوسائٹی پر اثر انداز ہونے والے طبقہ اشراف سے ان کا گہرا رابطہ ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے اہم واقعات کا ان کے لیے تانتا بندھا رہے گا جن میں تاریخ گوئی کے جوہر دکھانے کا برابر اچھا موقع دستیاب ہو۔ کسی کو خلعت ملی، کسی نے انعام پایا، کسی کو مہر عطا ہوئی، کسی کو دربار میں کرسی عنایت ہو گئی، کہیں شادی ہوئی، فرزند کا تولد ہوا۔ کوئی بیمار ہوا، کوئی اچھا ہوا اور کوئی جاں بحق تسلیم ہوا یا اگر کہیں کسی بادشاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی تو یہ اور اسی طرح کے ہزاروں مواقع تاریخ کہنے

والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ اور کشادا حوال کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتے تھے۔'' ۱۸؎

فرہنگِ تاریخ گوئی:

غور کیجیے جب بات بات پر تاریخ کہی جاتی ہو۔سوتے جاگتے چلتے پھرتے ،اٹھتے بیٹھتے تاریخیں سُجھائی دیتی ہوں ۔چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی تاریخ گو کے لیے اہمیت کا حامل بن چکا ہو۔ایسے عالم میں تاریخ گو استاد شاعر کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہوگی جو انھیں تاریخ کہنا سکھائے یا ان کی کہی ہوئی تاریخوں پر اصلاح دے۔شاعری میں تو استادی شاگردی کی پرانی روایت موجود ہے لیکن تاریخ گوئی کی تاریخ میں یہ روایت مفقود نظر آتی ہے۔شاعری میں اصلاح دینا بھی آسان ہوتا ہے۔اردو کی شعری روایت میں ایسے ایسے مشاق شعرا موجود رہے ہیں جو لمحوں میں اصلاح دے دیا کرتے تھے۔قادرالکلام اور مشاق شعرا کے لیے شاعری پر اصلاح دینا معمولی عمل ہوتا ہے۔داغ کے پاس سینکڑوں شاگرد شعرا کا کلام بغرضِ اصلاح آیا کرتا تھا اور وہ فی البدیہہ ان غزلوں کی اصلاح دیا کرتے تھے۔مشاق شعرا لمحہ بھر میں کسی بھی لفظ کو تبدیل کر کے شعر کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتے تھے اور ضرورت محسوس کرتے تو پورا مصرع ہی تبدیل کر دیا کرتے تھے لیکن تاریخ گوئی میں اس قسم کی سہولت موجود نہیں تھی۔جس طرح استاد شاعر کے لیے شاعری کا میدان وسیع ہوتا تھا کہ وہ جیسے اور جس طرح چاہتے اسے اپنی جولانیِ طبع کی جولان گاہ بنا لیتے۔اس کے برعکس تاریخ گو کے لیے تاریخ کا میدان اتنا ہی تنگ و تاریک اور غلام گردشوں کی طرح پیچ در پیچ ہوتا ہے۔مطلوبہ اعداد کے مطابق مناسب و برمحل الفاظ کی تلاش اور پھر اسے بحر اور وزن کے مطابق مصرعہ تاریخ میں کھپانا جوئے شیر لانے سے کم کام نہ ہوتا تھا۔یہ عمل دشوار بھی ہوتا تھا اور صبر طلب بھی۔مزید یہ کہ استاد کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا تھا کہ وہ گھنٹوں فکرِ تاریخ میں غرق بیٹھا رہتا۔معاشی ضرورتیں ایسے عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہیں۔تاریخ کے لیے تو میر اکرام علی اکرام کے مصرعہ تاریخ ''گھر کا نہ کام کرنہ کچہری کا کام آج'' جیسی صورت حال درکار ہوتی تھی۔ ۱۹؎ ایسا تو وہی شخص کر سکتا تھا جو فکر معاش سے آزاد ہو۔اس وجہ سے تاریخ گوئی کی تاریخ میں استادی شاگردی کی روایت مفقود ہے۔تاہم کلاسیکی کتب یا شعرا کے خطوط سے اِکّا دُکّا جو مثالیں دستیاب ہوتی ہیں انھیں تبرک ہی سمجھنا چاہیے۔اگر کوئی شاعر تاریخوں پر اصلاح دیتا بھی تھا تو کبھی کبھار اور انتہائی خاص اور مقرب شاگردوں کی تاریخوں پر۔وہ بھی اس شرط پر کہ وہ کسی کو اس حوالے سے نہ آگاہ کرے گا اور نہ مستقبل قریب میں تاریخ کی فرمائش کرے گا کیونکہ دونوں صورتوں میں استاد شاعر کو ذہنی کوفت ہ کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔پہلی صورت میں ملنے والوں کی طرف سے اور دوسری صورت میں بتانے والے کی طرف سے۔

جب استاد شاعر بھی نومشق تاریخ گو کی دست گیری سے تعلق قطع کر لے اور معاشرہ تاریخوں کا طلب گار ہو تو ایسے عالم میں ایسی کتب کی ضرورت شدت سے پیش آتی ہوگی جو زیادہ سے زیادہ تاریخیں کہنے میں تاریخ گو شعرا کے لیے مددگار کے طور پر کام آسکیں شاید اسی ضرورت کے تحت انیسویں صدی میں شعرا نے ایسی فرہنگیں تیار کر رکھی تھیں جن کی مدد سے وہ بآسانی ہم عدد لفظ یا جملے تلاش کر کے اپنی تاریخوں میں خوبصورتی سے نظم کر دیتے تھے۔جس طرح فیکٹریوں اور کارخانوں میں خام مال موجود ہوتا ہے

جنھیں خریدار کی خواہش اور فرمائش کے مطابق اجزا کو جوڑ کر مطلوبہ چیز تیار کر لی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح اس عہد میں تاریخ گو شعرا کے پاس یہ فرہنگیں تاریخ بنانے کے کارخانے یا فیکٹریاں تھیں جن کی مدد سے تاریخ گو شعرا الفاظ اور تاریخی مادوں کو جوڑ کر مطلوبہ تاریخ تیار کر لیا کرتے تھے یا کسی بھی موزوں مصرعے میں ان فرہنگوں میں موجود الفاظ کو تلاش کر کے لفظی تبدیلی کے ساتھ مطلوبہ تاریخی مادہ نکال لیا کرتے تھے۔ یہ فرہنگیں تاریخ گو شعرا کے لیے ایسا مددگار مواد بن چکی تھیں جن کی مدد سے آسانی کے ساتھ تاریخ میں خوبصورتی پیدا کرنے اور انھیں بحر کے سانچوں میں ڈھال کر اپنی مطلوبہ خواہش پوری کرنا اب ایک کھیل بن کر رہ گیا تھا۔

ایک وقت وہ تھا جب اچھے تاریخی مادے کا حصول تائید غیبی سے منسوب کیا جاتا تھا لیکن فرہنگِ تاریخی کی اشاعت کے بعد غالبؔ سے معذرت کے ساتھ ''بازیچہء اطفال ہے مادّہ مرے آگے'' کی صورت حال جنم لے چکی تھی۔ چٹکیوں میں تاریخ نکال لی جاتی تھی۔ اس سہولت کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ تاریخ گوئی کا شوق عام ہو گیا۔ ہر گلی کوچے میں تاریخ گو شعرا پیدا ہو گئے لیکن نقصان یہ ہوا کہ تاریخی مادّوں کی بہتات تو ہو گئی لیکن اچھے تاریخی مادّے تاریخ گو شعرا کے تناسب سے کم بہم پہنچنے لگے اور معیوب اور زبردستی کی تاریخیں زیادہ تعداد میں سامنے آنے لگیں۔ اسی وجہ سے انیسویں صدی کی دوسری نصف صدی میں ایسی ایسی فضول، بے کار اور زبردستی کی تاریخیں سامنے آئیں جنھیں دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ ایسی تمام تاریخوں کو اکٹھا کیا جائے تو ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچے گی۔ جب کسی مال کی کساد بازاری ہو جائے تو وہ اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے پھر نہ اس کے معیار کی طرف توجہ دی جاتی ہے اور نہ وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن پاتا ہے۔ اس عہد میں تاریخ گو شعرا کی کساد بازاری عام ہو چکی تھی۔ ہر کہ و مہ شاعر اور اس پر مستزاد یہ کہ تاریخ گو شاعر بنا پھرتا تھا اور اس فکر میں رہتا تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا واقعہ رونما ہو تو اسے اپنی صلاحیت آزمانے کا موقع مل جائے۔ اس عہد کی تاریخوں اور تاریخ گو شعرا کی تعداد کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ پیش آمدہ واقعات کم اور تاریخ گو زیادہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک ہی واقعے کی بیسیوں تاریخیں کہی جاتی تھیں۔ جن میں بیشتر غیر معیاری ہوتی تھیں جنھیں زبردستی کی تاریخیں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ایسی ہی تاریخوں کو محبوب علی جوہرؔ نے ''اوٹ پٹانگ تاریخیں'' کہا ہے۔[۲۰] جب کسی بھی مال کی بہتات ہو جائے تو وہ بے قدری کا شکار ہو کر بے وقعت ہو جاتا ہے۔ ایسے عالم میں مال کی بے قدری کو روکنے اور قابلِ توجہ بنانے کے لیے ایسی تبدیلیاں عمل میں لائی جاتی ہیں جس سے نئے پن کا احساس ہو کیونکہ 'کل جدید لذیذ' کے تحت ہر نئی چیز خوبصورت اور خوش نما دکھائی دیتی ہے اور لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مزید یہ کہ خریدار کی نظر میں بھی معتبر ٹھہرتی ہے۔ تاریخ گوئی کی کساد بازاری کے بعد مشاق اور طباع تاریخ گو شعرا اپنی تاریخوں کو نوآموز اور متشاعر تاریخ گو شعرا کی تاریخوں سے منفرد اور ممتاز بنانے کے لیے نئی نئی جدتوں کا سہارا لیتے تھے۔ اسی وجہ سے اس عہد میں نئی نئی صنعتوں میں تاریخ کہنے کا رواج پڑ گیا تھا۔ میرا ہرگز یہ نقطہ نظر نہیں کہ اس سے قبل صنعتوں میں تاریخیں نہیں کہی جاتی تھیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اب تاریخیں نت نئے انداز اور نئے نئے طریقوں سے کہی جانے لگیں۔ کبھی دائروں میں تاریخیں کہی جاتیں تو کبھی مربع خانوں میں، کبھی درختوں کی شکل بنا کر تاریخیں نکالی جاتیں تو کبھی کسی اور انداز میں۔ اس عہد کی اردو شاعری میں مستعمل تمام اصناف اور صنعتوں میں تاریخیں کہی گئیں۔ غرض منفرد و ممتاز رہنے کے شوق نے تاریخ گو شعرا سے نہ جانے کیا کیا کروایا۔ شعرا رونما ہونے والے واقعات کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے جیسے ہی کوئی واقعہ رونما

ہوتا اس کی فوراً تاریخ کہی جاتی۔ مبادا کوئی دوسرا سبقت لے جائے اور یہ منہ دیکھتے ہی رہ جائیں۔ اس سبقت لے جانے کی دوڑ میں بعض اوقات مضحکہ صورت حال بھی پیدا ہو جاتی تھی۔

ایسے عالم میں جب شعرا کے بڑے یا چھوٹے ہونے یا اہم اور غیر اہم ہونے کا دارومدار تاریخ گوئی کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہو تو وہ شعرا جنھوں نے تاریخ گوئی میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے فرہنگیں تیار کر رکھی تھیں، کسی کو دکھانے یا دینے پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے۔ یہ فرہنگیں تو ان کا وہ سہارا تھیں جن کے بل پر ان کی تاریخ گوئی کا بھرم قائم تھا۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں اس بھرم کو کیوں اور کس لیے توڑتے؟ یہ فرہنگیں تو ان کے لیے خضرِ راہ کا کام دیتی تھیں اور اس وقت کے لوگوں کے لیے جادوئی چراغ تھا جس کی مدد سے لمحوں میں تاریخ گوئی کے مشکل مرحلے طے کر لیے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے ان فرہنگوں کے نام بھی سرمایہء تاریخ، آئینہء تاریخ، گلبن تاریخ، گنجینہء تاریخ رکھے گئے۔ ایسے گلشن، گنجینہ اور سرمایہ کو کیسے کسی دوسرے کے حوالے کیا جا سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں ان کا وہ جن جسے انھوں نے بوتل میں بند کر کے اپنی دست رس میں کر رکھا تھا اسے کسی دوسرے کے ہاتھ لگ جانے کا خدشہ لاحق تھا اس لیے اس خضر کو کسی کو دکھانا تو کجا بتانا بھی مناسب نہ سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان فرہنگوں کی مدد سے کوئی بھی نومشق شاعر تاریخیں کہہ کر (غیر معیاری ہی سہی) ان کی برابری کرنے کا دعویٰ کر کے ان کے منہ کو آ سکتا تھا۔ اس طرح ان کے تخصیصی امتیاز پر ضربِ کاری لگ سکتی تھی اور ان کی تاریخ گوئی کی صلاحیت اور مشاقی کا بھرم بھی کھل سکتا تھا۔ اس حوالے سے نثار علی شہرت کا بیان خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اور وہ (تاریخ گو شعرا) لوگوں سے اسے (بیاضوں کو) ایسا ہی چھپا رکھتے تھے جس طرح بادشاہ اور امرا جواہرات کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال کہ ہم اس ذخیرہ کے ذریعہ عمدہ عمدہ تاریخیں نکال لیتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے کے ہاتھ یہ ذخیرہ لگ گیا تو وہ بھی عمدہ تاریخیں کہنے لگے گا۔ جس سے اس فن کی کساد بازاری ہوگی۔ وہ ذخیرہ جزو دو جزو چھپوایا تو کیوں جاتا کسی کو دکھایا بھی نہ جاتا تھا۔'' (ص ۲۱)

اس عہد میں تاریخ زندگی کا لازمہ بن چکی تھی۔ کسی کا بچہ پیدا ہوا تو تاریخ لازمی قرار پائی۔ پھر بچے کے تاریخی نام کی فکر ہوئی تو تاریخ گو شعرا کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ عقیقہ ہوا تو تاریخ گو کی طرف دوڑنا پڑا۔ بچے کا ختنہ ہوا تاریخ گو کی ضرورت لاحق ہوئی۔ بسم اللہ کی رسم کی تو اس کی تاریخ کی بھی فکر ہوئی۔ مکتب بٹھایا تو تاریخ کہلوائی گئی۔ بخار ہوا تو تاریخ ہوئی۔ امتحان میں کامیابی ہوئی، نوکری مل گئی، شادی ہوئی تو تاریخ کہلوائی گئی۔ مکان بنوایا تو اس کی پیشانی پر تاریخِ تعمیر و تکمیل لگانا ضروری ہوا۔ حج، عمرہ یا زیارت پر جانا ہوا تو تاریخ کہلوائی گئی۔ موت ہو گئی تو تاریخ کہی گئی۔ غرض زندگی سے موت تک کے واقعات تاریخوں کے زمرے میں آتے تھے۔ اس لیے مہد سے لحد تک کے تمام واقعات کی تاریخیں کہی جاتی تھیں یا کہلوائی جاتی تھیں۔ چونکہ تاریخ کہنا یا کہلوانا ایک دقت طلب کام تھا اس لیے اس مشکل کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تاریخ گو شعرا کی طرف رجوع کرنا پڑتا۔ تاریخ گو شعرا کی طرف لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس عہد میں تاریخ گو شعرا کی قدر عام شاعر سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لوگ تاریخ کہلوانے کے لیے تاریخ گو شعرا کے آگے پیچھے پھرتے۔ تاریخیں کہلوانے کے لیے ان کی منتیں کرتے، خوشامد کرتے، تحفے تحائف دیتے، انعامات

دیتے۔یہی وجہ ہے کہ جب حسین علی فرحت کی تاریخی ناموں کی فرہنگ ''موجد التواریخ'' شائع ہوئی تو سید محمد مرتضیٰ متخلص بہ بیان و یزدانی کو لکھنا پڑا'' کہ (اس فرہنگ کی اشاعت نے)''عام و خاص کو شاعروں کی خوشامد سے چھڑا دیا''۔[۲۲]

تاریخ کہنا اگرچہ مشکل کام تھا۔ایک ایک مادے یا تاریخ کے حصول کے لیے بعض اوقات کئی کئی دن مغز ماری کرنا پڑتی تھی۔تب کہیں جا کر اچھی تاریخ یا مادہ ءتاریخ ہاتھ آتا تھا لیکن بعض اوقات خلاف توقع پلک جھپکتے ہی تاریخ ہو جاتی تھی۔جس طرح اڑتی ہوئی چڑیا اچانک ہاتھ آ جاتی ہے۔اسی طرح مادہ ءتاریخ معمولی کوشش سے ہاتھ آ جاتا تھا۔کبھی کبھی تو کئی کئی دنوں کی محنت کے بعد بھی اچھی تاریخ سُجھائی نہیں دیتی تھی۔محبوب علی جودت لکھتے ہیں ''جب میں اس فن تاریخ گوئی کی حالت کو بہ نظر غور دیکھتا ہوں تو زمانہ گذشتہ و حال میں زمین آسمان کا فرق پاتا ہوں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس طرح شاعری نے بہت بڑی ترقی کی اسی طرح فنِ تاریخ گوئی کی ترقی بھی آسمانوں سے باتیں کرنے لگی ہے اور زیادہ ترقی کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تاریخ گو الفاظ کے اعداد کے جوڑنے اور تلاش و فکر میں بہت وقت صرف کرتے تھے اور اس پر بھی بھروسا نہ تھا کہ تاریخ نکلے یا نہ نکلے۔اگر کوئی پورا مادہ عمدہ نکل آتا تو سمجھتے تھے کہ گویا ہم کو الہام ہو گیا''۔[۲۳] سید احمد دہلوی مصنف فرہنگِ آصفیہ لکھتے ہیں:''۔ایک زمانہ وہ تھا کہ اس قسم کے الفاظ ہاتھ لگ جانے یا ذہن میں آ جانے کو سروش غیب یا ہاتف غیبی سے تعبیر کیا کرتے تھے اور کئی کئی دن کسی تاریخ کا مادہ نکالنے میں صرف ہو جاتے تھے۔''[۲۴] مشاق اور قادر الکلام تاریخ گو حامد حسن قادری نے ہزاروں تاریخیں کہیں۔تاریخ گوئی پر انھیں ملکہ حاصل تھا۔تاریخیں کہنے پر انھیں اتنی قدرت حاصل تھی کہ چلتے پھرتے تاریخ کہہ لیا کرتے تھے۔ان کا بیان ہے:''بارہا ایسا ہوا کہ پہلی بار جو مصرع ذہن میں آیا بغیر کسی کمی و بیشی کے اس میں پوری تاریخ نکل آئی۔چند بار ایسا ہوا کہ کسی واقعہ کی تاریخ کہنے بیٹھا اور چند چند منٹ کے بعد ادنیٰ فکر و تامل سے نکلتی چلی آئیں۔گھنٹہ دو گھنٹہ میں آٹھ آٹھ دس دس مادّے کہہ لیے ہیں اور بارہا اتفاق ہوا ہے کہ ایک تاریخ کے لیے گھنٹوں بلکہ کئی کئی دن فکر کی ہے اور ہاتھ نہیں آئی۔''[۲۵]

تاریخ کہنا تو مچھلی پھنسانے کے عمل کی طرح کا معاملہ تھا کہ کبھی کانٹا ڈالتے ہی مچھلی پھنس جاتی ہے اور کبھی کئی کئی دن تک شکاری مراد کو پہنچ نہیں پاتا اور کبھی کبھی تو نامراد ہی لوٹنا پڑتا ہے۔تاریخ گو شاعر کبھی تو پلک جھپکتے ہی مادہ ءتاریخ پا لیتا تھا تو کبھی ساری ساری رات پلک جھپکائے بیٹھا رہتا لیکن تاریخ نہیں ہو پاتی تھی۔حسین علی فرحت نے اس مشقت کو جھکندن اٹھانا اور وقت ضائع کرنا کہا ہے۔وہ لکھتے ہیں:''خاکسار نے یہی خیال کر کے فن تاریخ میں یہ کتاب ام التواریخ سالہا سال کی محنت سے تصنیف کی ہے اور اپنی یادگار ملک کو دی ہے کہ اس فن کے طالب آسایش پائیں اور یہ جھکندن نہ اُٹھائیں کہ ایک تاریخ کہنے میں بہت سا وقت گنوائیں۔[۲۶]

تاریخ کہنے کے لیے جس ذہنی فراغت کی ضرورت ہوتی تھی اس کے لے لازم تھا کہ گھر اور باہر کے کاموں کو ایک طرف رکھ دو اور تاریخ کہنے کی مشقت میں جُت جاؤ۔تب جا کر کوئی مادہ ءتاریخ ہاتھ آتا تھا۔منشی میر اکرام علی اکرام بلگرامی مختار عدالت کانپور'آئینہ ءشائق' کے قطعہ ءتاریخ میں لکھتے ہیں:

تاریخ گو کے حق میں یہ ایسا ہے آئینہ حیرت سے جس کو دیکھتے ہیں خاص و عام آج

تاریخ اُس کے طبع کی اکرام تو بھی لکھ گھر کا نہ کام کر نہ کچہری کا کام آج ۲۷

تاریخ کے اس مشکل عمل میں مشاق تاریخ گو اور نوآموز تاریخ گو دونوں برابر تھے۔کلاسیکی کتابوں کے دیباچوں، تقریظوں میں مشاق شعرانے اس مشکل کا ذکر کیا ہے۔سید محمد مرتضیٰ بیان ویزوانی کے ایک شعر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

تھی ایسی رفعت ایوانِ اعداد کہ گر جاتی تھی دستارِ فضیلت ۲۸

ایسا تاریخی مادہ جو فوراً اور بغیر کسی کاوش کے ہاتھ آجاتا تھا اسے شعرا تائیدِ غیبی سمجھتے اور الہام کہتے تھے۔۲۹

ضرورت تاریخ:

چونکہ تاریخ کہنا عرق ریزی اور دماغ سوزی کا کام تھا اس لیے مشاق تاریخ گو شعرا کو بالعموم اور نوآموز تاریخ گو شعرا کو بالخصوص بہت محنت کرنا پڑتی تھی۔مطلوبہ اعداد کے موافق الفاظ کی تلاش اور مصرع میں وزن کے مطابق اس کا درست مقام پر اندراج کسی معرکہ سر کر لینے سے کم نہ ہوتا تھا۔کبھی مطلوبہ لفظ مل جاتا تو مادہ ءتاریخ وزن سے موافق نہ ہو پاتا تو کبھی موافق لفظ مل جاتا تو اعداد کی کمی بیشی حائل ہو جاتی۔یہ کھیل کئی کئی دنوں پر محیط رہتا اور مادہ ءتاریخ کا حصول طوالت پکڑ لیتا تھا۔نثار علی شہرت کا بیان ہے۔''شعرانے جب دیکھا کہ کئی کئی روز تک محنت کی جاتی ہے پھر بھی کبھی تاریخ نکلتی ہے اور کبھی نہیں نکلتی۔اس لیے ایسے الفاظ کے اعداد نکالے جاویں جن کی تاریخ میں ضرورت ہوتی ہے۔''۳۰ یہی ضرورت تاریخی الفاظ کے لغات کی تالیف کی اصل وجہ بنی۔

ابتدائی نقوش کی تکمیل:

تاریخ گوئی کی فرہنگوں کے ابتدائی نقوش کب بنے اس کے بارے میں فی الوقت کوئی ثبوت میسر نہیں۔بعض شواہد کی مدد سے تاریخی الفاظ کی فرہنگوں کے ابتدائی نقوش کے قریب ترین سنین متعین کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

آغاز آغاز میں تاریخ گو شعرانے اپنی بیاضوں میں چند تاریخی مادے اور الفاظ لکھ رکھے ہوں گے پھر رفتہ رفتہ ان تاریخی مادوں اور الفاظ میں اضافہ ہوتا رہتا ہوگا۔یہاں تک کہ تاریخی الفاظ کے یہ صفحات علیحدہ بیاضوں کی صورت اختیار کر گئے ہوں گے۔جس طرح اردو اور فارسی شاعری کے تذکرے ارتقائی عمل سے گزرے بالکل اسی طرح تاریخی الفاظ کی فرہنگیں بھی اسی عمل سے گزری ہوں گی۔تاریخی الفاظ کی یہ بیاضیں تاریخ گو شعرانے اپنی سہولت کی خاطر بنا رکھی تھیں۔ان بیاضوں میں تاریخ میں استعمال ہونے والے مادے اعداد کی مناسبت سے درج کر رکھے تھے اور وقتاً فوقتاً ضرورت کے تحت ان بیاضوں سے مدد لیتے رہتے تھے۔اس طرح مطلوبہ لفظوں یا مادہ ءتاریخ کی تلاش کے لیے زیادہ دماغ ماری نہیں کرنی پڑتی تھی۔یہ بیاضیں یا کتابچے بہت مختصر ہوتے تھے جو حاملِ بیاض شاعر کی ضرورت کے لیے کافی ہوتے تھے۔اس موقف کی تائید نثار علی شہرت کے درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے:''غدر سے پہلے جو بڑے بڑے اوستاد گزرے ہیں ہم کو نج کے طور پر معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے بہت الفاظ کے اعداد نکال رکھے تھے جو ان کا اس فن کے متعلق ذخیرہ ہوتا تھا اور جس کی ضخامت جزو دو جزو سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔''۳۱

یہ بیاضیں اور رسالے لغاتِ تاریخ گوئی کے ابتدائی نقوش تھے جن کی تخلیق تاریخ گو شعرانے اپنی ضروریات کے لیے

کر رکھا تھا۔ یہ بیاضیں ان کے لیے کسی بھی نعمت سے کم نہیں تھیں۔ گویا یہ ان کے ہتھیار تھے جن کی مدد سے وہ تاریخی مادوں کا شکار کیا کرتے تھے مزید یہ کہ یہ ان کی شب و روز کی محنت کا حاصل بھی تھیں۔ ایسے گوہرِ کمیاب کی حفاظت بہت احتیاط کی متقاضی تھی مبادہ یہ چوری ہو جائے یا گم ہو جائے۔ اس لیے نہ تو اس کے متعلق اپنے قریب ترین رفقا اور احباب کو بتایا جاتا تھا اور نہ کسی کو دکھایا جاتا تھا۔ کسی کو دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گویا یہ بیاضیں داستانوں کے طلسمی طوطے کے موافق تھیں جن میں ان کے مرتبوں کی جانیں اٹکی ہوتی تھیں۔ مزید یہ کہ یہ بیاضیں ان کے مرتبوں کے لیے روزی روٹی کا سامان بھی فراہم کرتی تھیں پھر کس طرح اس زادِ راہ کو کسی اجنبی یا رہزن کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ اس حوالے سے نثار علی شہرت کا بیان دلچسپی کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اور وہ (تاریخ گو شعرا) لوگوں سے اسے (بیاضوں کو) ایسا ہی چھپا رکھتے تھے جس طرح بادشاہ اور امرا جواہرات کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال کہ ہم اس ذخیرہ کے ذریعہ عمدہ عمدہ تاریخیں نکال لیتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے کے ہاتھ یہ ذخیرہ لگ گیا تو وہ بھی عمدہ تاریخیں کہنے لگے گا۔ جس سے اس فن کی کساد بازاری ہوگی۔ وہ ذخیرہ جزو در جزو چھپوایا تو کیوں جاتا کسی کو دکھایا بھی نہ جاتا تھا۔''[۳۲] چونکہ ان فرہنگوں کو چھپا چھپا کر رکھا جاتا تھا اور ان کے متعلق بتایا بھی نہیں جاتا تھا اس لیے یہ کہنا فی الوقت ممکن نہیں کہ پہلی فرہنگ کس نے اور کب بنائی؟ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ لغات بیسویں صدی کے نصف اول میں بنائی جا چکی تھیں۔ اس بات کے ثبوت میں نثار علی شہرت کا درج ذیل بیان پیش کیا جاتا ہے۔

''۱۸۵۸ء میں جب ہمارے والد ماجد جناب میر حسین علی صاحب فرحت نے دیکھا کہ شاعروں اور تاریخ گویوں کو تاریخ نکالنے میں دقت کیا مصیبت پیدا ہوتی ہے تو انھوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا نام ام التواریخ رکھا اور ہم نے اس کا نام آلہ تاریخ رکھا تھا۔ جس میں دو ہزار اعداد کے الفاظ ہر عدد کے متعلق بہت سے ہیں۔ چنانچہ یہ ضخیم کتاب شائع ہوئی جس سے تاریخ گویوں کو ایسی سہولت ہوگئی ہے کہ اس کتاب کی مدد سے وہ ایک گھنٹہ میں دس پانچ تاریخیں عمدہ لکھ لیتے ہیں۔''[۳۳]

یہ بیاضیں ایک دو نہیں بہت سے تاریخ گو شعرا نے بنائی ہوئی تھیں۔ ہمارے پاس ان بیاضوں کے حوالے سے معلومات کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جن کی مدد سے پتہ لگا سکیں کہ کس کس شاعر یا تاریخ گو نے یہ بیاضیں بنا رکھی تھیں۔ البتہ تاریخی لغات کی اشاعت کے بعد کے معاصر اخبارات سے کچھ معلومات میسر آنے کا امکان ہے۔ فی الوقت نثار علی شہرت کا متذکرہ بالا بیان ہی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ان فرہنگوں کا شائع ہونا تھا کہ جواہرات کی طرح مخفی تمام بیاضیں اپنی اہمیت سے دست کش ہونے پر مجبور ہوگئیں۔ پھر یہ کہ ہر شخص اس کی اشاعت کی استطاعت بھی نہیں رکھتا تھا اور بہت سی بیاضیں چونکہ وقتی ضرورت کا سامان تھیں اس لیے بعد میں ان کا سامنے آنا بھی سود مند نہ تھا۔

ان بیاضوں کی اشاعت سے تاریخ گوئی کا فن آسان بن گیا۔ ان لغات نے ماہر، مشاق اور قادر الکلام شاعروں کی صلاحیتوں کو مزید تقویت دی۔ نئی نئی صنعتوں میں تاریخیں کہنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ یہ حوصلہ ماہر شعرا کو بھی حاصل ہوا اور مبتدی کو بھی۔ وہ کام جو ہفتوں مہینوں میں ہوتا تھا اب وہ دنوں اور گھنٹوں میں ہونے لگا۔ اس کی تائید منشی سید محمد عبدالغنی کانپوری کے اشعار سے بھی ہوتی ہے۔

سخت تھا تاریخ گوئی کا یہ فن ‏ اب نہایت ہی سہولت ہو گئی
جن صنائع میں تھے عاجز منتہی ‏ مبتدی کو ان پہ قدرت ہو گئی
ہفتوں جس تاریخ پر ہوتی تھی فکر ‏ چند گھنٹوں کی وہ محنت ہو گئی
ہیں مفید اور کارآمد لفظ جمع ‏ سہل شاعر کی ریاضت ہو گئی
اک زمانہ سے تھا دل کو شوقِ دید ‏ دیکھ آئینہ کو حیرت ہو گئی
۱۰۸۴ + ۸۱۰=۱۸۹۴ء ۳۴

اردو کی اولین فرہنگِ تاریخ:

اولین مرتبہ فرہنگِ تاریخ کے بارے میں تو کوئی حتمی رائے دینا ممکن نہیں اس لیے کہ انیسویں صدی میں بہت سے شعرا اور ادبا نے یہ فرہنگیں اپنی استطاعت اور وقتی ضرورت کے لحاظ سے مرتب کر رکھی تھیں۔ یہ فرہنگیں اتنی رازداری سے بنائی جاتی تھیں کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ ان فرہنگوں کے متعلق نہ کسی کو بتایا جاتا تھا اور نہ کسی کو یہ فرہنگیں دکھائی جاتی تھیں۔ ان فرہنگوں کی ترتیب میں سالہا سال کی محنت صرف ہوتی تھی۔ مرتبِ فرہنگ ہر سال اس میں بہت سے الفاظ کا اضافہ کرتا رہتا تھا۔ تقریباً ہر فرہنگ نویس ایسا ہی کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تاریخ گو کو تاریخ کے لیے نئے نئے مادوں کی ضرورت ہوتی تھی اور نئی تاریخوں کے لیے ہزاروں الفاظ کی فرہنگ بھی ناکافی ہوتی تھیں۔

نئی فرہنگوں کی ترتیب میں فرہنگ نگاروں کو سالہا سال محنت کرنا پڑتی تھی۔ مرتبِ فرہنگ کی وفات کے بعد ورثے کے طور پر یہ فرہنگیں اگلی نسلوں کو منتقل ہو جاتی تھیں۔ سعادت مند اخلاف میسر آجاتے تو ان میں اضافہ ہوتا رہتا، بصورت دیگر اسی حالت میں پڑی رہتی جس حالت میں مرتب اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ سعادت مند وارثوں میں ایک نام محبوب علی جودت کا بھی ہے۔ یہ حسین علی فرحت کے صاحب زادے تھے۔ انھوں نے ام التواریخ کے دوسرے ایڈیشن میں بہت سے نئے الفاظ اضافہ کر کے اسے شائع کروایا۔ ۳۵

اردو کی اولین مطبوعہ فرہنگ کی تخلیق کے دعوے دار مصنفین دو ہیں۔ حسین علی فرحت مرتب 'ام التواریخ' اور منشی رام پرشاد ظاہر مرتب 'کانِ تاریخ'۔ دونوں مرتبوں نے اپنی اپنی فرہنگوں میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی فرہنگ اولین مطبوعہ فرہنگ ہے اور اس سے قبل کوئی فرہنگ شائع نہیں ہوئی۔ حسین علی فرحت کا بیان ہے۔:

''اگر یہ کہا جاوے تو بے جا نہو گا کہ اس جامع کتاب سے قبل کوئی رسالہ اس فن میں مروج نہ تھا لیکن بعد میں چند صاحبوں نے اس میں سے الفاظ چن کر نئی کتاب بنالی ہیں۔ اس لیے دو سال محنت کر کے نئے نئے اعداد کے الفاظ اور نکال کر اس میں شامل کیے گئے اور نیز وہ ضروری قواعد جو تاریخ گوئی کے متعلق زیادہ بکارآمد ہیں اس طبع ثانی میں بڑھا دیے گئے ہیں جس کے سبب سے یہ کتاب مکمل اور جامع فن تاریخ میں تیار ہوگئی ہے۔ اب تاریخ گویوں کے لیے یہ کتاب رہبر اور رہنما ہے۔'' ۳۶ اس

بیان میں حسین علی فرحت کے صاحب زادے نے دعویٰ کیا ہے کہ ام التواریخ سے قبل کوئی فرہنگِ تاریخ شائع نہیں ہوئی۔ 'کانِ تاریخ' کے مؤلف منشی رام پرشاد ظاہر بھی اپنی فرہنگ کی اولیت کے دعوے دار ہیں۔ ان کا دعویٰ درج ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

کانِ تاریخ جب چھپی ظاہر جس نے دیکھا اسے وہ شاد ہوا
قبل ازیں مشتہر زمانے میں فنِ تاریخ میں رسالہ نہ تھا
جیسے علم عروض کو پہلے عربی میں خلیل نے لکھا
تو بھی اس علم کا خلیل ہوا تو نے اردو میں اس کو جمع کیا [۳۷]

دونوں مرتبین کا دعویٰ پائے سند کو نہیں پہنچتا۔ ان دونوں فرہنگوں سے پہلے میر محمد حسین حیدر آبادی کی فرہنگ ''مساوی الاعداد'' شائع ہو چکی تھی۔ یہ فرہنگ ۱۲۸۵ھ میں فیض عام پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی۔ سرورق کی عبارت یہ ہے: ''ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ۔ مساوی الاعداد ۱۲۸۵ھ بمطبع محمد عبدالواحد فیض عام واقع بلدہ حیدر آباد دکن طبع شد۔'' یہ فرہنگ اپنی ترتیب سے تکمیل تک جن مراحل سے گزری اس کا سب احوال اختصار کے ساتھ درج ہے۔ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد حسین طبعِ موزوں رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی سال پیشتر اس فرہنگ کو مرتب کرنا شروع کیا تھا لیکن عین جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا اور یہ فرہنگ ادھوری رہ گئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے قدر ان مرزا علی خان لطف نے اس فرہنگ کو مکمل کرنے کے لیے کمرِ ہمت کس لی لیکن استاد کی پیروی میں اس فرہنگ کو ادھورا چھوڑ کر استاد کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے بعد اس فرہنگ کا قلمی مسودہ مرزا کے شاگرد غلام ضامن کرم کی تحویل میں رہا۔ ان کے انتقال کے بعد محمد جمال الدین خان بہادر مدار المہام ریاست بھوپال کے حکم پر محمد عبدالواحد عثمانی نے غلام ضامن کرم کے وارثوں سے اس فرہنگ کے مسودے کو حاصل کیا۔ یہ فرہنگ نامکمل حالت میں ہی حیدر آباد سے ۱۲۸۵ھ میں شائع ہوئی۔ ذیل میں بہ ترتیبِ سنین تمام دستیاب مطبوعہ فرہنگیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ مساوی الاعداد، میر محمد حسین حیدر آبادی، فیض عام پریس حیدر آباد دکن، ۱۲۸۵ھ
۲۔ ام التواریخ، حسین علی فرحت، دہلی پنچ پریس، لاہور، ۱۲۸۹ھ
۳۔ آئینۂ تواریخ ملقب بہ تحفۂ شائق، حافظ الٰہی بخش شائق، مطبع نظامی کانپور، ۱۲۹۳ھ
۴۔ کانِ تاریخ، منشی رام پرشاد دہلوی، مطبع انوری، آگرہ، ۱۲۹۴ھ
۵۔ گلشنِ خیال، مولوی محمد سعید، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۹۷ھ
۶۔ موجد التواریخ، محمد حسین علی فرحت، شگوفہ پریس، میرٹھ، ۱۳۰۲ھ
۷۔ نصیحت مختصر، شاہ محمد علیم اللہ آبادی، مطبع البلاغ، لکھنؤ، ۱۳۰۵ھ
۸۔ گنجینۂ تواریخ، میر نادر علی رعد، مطبع فخر نظامی، حیدر آباد دکن، ۱۳۱۳ھ
۹۔ گلبن تاریخ، میر مہدی حسین رضوی الم، مطبع فخر نظامی، حیدر آباد دکن، ۱۳۱۳ھ
۱۰۔ زنبیلِ تاریخ، منشی محمد انوار حسین تسلیم سہسوانی، مطبع اخبار نیر اعظم، مراد آباد، ۱۳۲۰ھ

۱۱۔ تاریخی خزانہ، حافظ فیروز الدین سکھے زئی، اسلامیہ سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۸ء
۱۲۔ تاریخ الاسماء، سید ابرار حسین ہاشمی، مطبع فتح پور ہسوہ، ۱۹۲۵ء
۱۳۔ معادن تاریخ، محمد زبیر فاروقی، مشہور آفیسٹ پریس، کراچی، ۱۹۸۵ء
۱۴۔ لغاتِ ابجد شماری، سید احمد، قومی کونسل برائے قومی برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

یہ فرہنگیں دو قسم کی ہیں۔ پہلی قسم کی فرہنگوں میں وہ فرہنگیں شامل ہیں۔ جو اعداد کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کی گئیں۔ زیادہ تر فرہنگیں اسی طرح کی ہیں۔ دوسری قسم کی وہ فرہنگیں ہیں جو حروف اور الفاظ کی بجائے اعداد کی ترتیب کے حوالے سے افراد کے ناموں پر مشتمل ہیں۔ یہ فرہنگیں انیسویں صدی میں پیدا ہونے والے بچوں کے تاریخی نام رکھنے کی غرض سے ترتیب دی گئیں۔ ان فرہنگوں میں 'موجد التواریخ'، 'تاریخی خزانہ'، 'تاریخ الاسما' شامل ہیں۔ لغاتِ ابجد شماری میں بھی کتاب کے آخر میں ناموں کا ایک ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔

شہرتِ عام:

فرہنگِ تاریخ کا چھپنا تھا کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ 'مساوی الاعداد' شائع ہوئی تو نایاب ہوگئی، 'ام التواریخ' شائع ہوئی تو کم یاب ہوگئی، 'کانِ تاریخ' شائع ہوئی تو ختم ہوگئی، 'آئینہء تاریخ' شائع ہوئی تو عنقا ہوگئی۔ غرض جو فرہنگ شائع ہوتی اس کی تمام کاپیاں بہت مختصر وقت میں فروخت ہو جاتیں۔ تاریخ گو شعرا کے لیے تو یہ ایسی مشینیں تھیں جن کی مدد سے آناً فاناً کئی کئی تاریخیں بنائی جا سکتی تھیں۔ جیسے ہی لوگوں تک ان کی اشاعت کی خبریں پہنچیں فوراً خرید لی گئیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مذکورہ بالا فرہنگوں کی پہلی اشاعت ہندوستان اور پاکستان میں کم یاب ہی نہیں نایاب ہو چکی ہیں۔ اکا دکا کتاب خانوں ہی میں ان اولین فرہنگوں کی پہلی اشاعتیں موجود ہوں گی۔ بیشتر کتب خانوں میں ان کی (سوائے کانِ تاریخ کے کہ اس کی صرف ایک اشاعت ہی عمل میں آئی) دوسری اشاعتیں ہی ہم دست ہوتی ہیں۔ 'ام التواریخ' دوبارہ شائع ہوئی تو مولوی سید محمود گرامی نے اس کی تاریخ کہی۔ اس کا ایک شعر یہ ہے

ہما کی طرح تھی یہ نایاب بالکل ملی آج دولت زمانہ کی کھوئی ۳۸

منشی سید محمد عبدالغنی کانپوری نے 'آئینہء شائق' کی دوسری اشاعت کی تاریخ کہی تو اس کا مادہء تاریخ بھی خوبصورت نکالا۔ جس سے اس کتاب کی نایابی کی خبر بھی ملتی ہے۔

اک زمانہ سے تھا دل کو شوقِ دید دیکھ آئینہ کو حیرت ہو گئی

۱۰۸۴ + ۸۱۰=۱۸۹۴ء ۳۹

ان فرہنگوں کا چھپنا تھا کہ عوام اس کو دیکھنے اور خریدنے کے لیے دوڑ پڑے۔ مطبوعہ فرہنگوں کی تمام کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں۔ ان فرہنگوں کی دستیابی تاریخ گو شعرا کے لیے ایسا تھا گویا ان کے ہاتھ الہ دین کا چراغ لگ گیا ہو جس کی مدد سے

جب چاہیں تاریخ بنالیا کرتے تھے۔ان فرہنگوں کی اشاعت کے بعد تاریخ کہنے کے لیے نہ کسی استاد کی خوشامد کرنے کی ضرورت تھی نہ کسی منشی کی منت سماجت کی۔ان فرہنگوں نے نومشق تاریخ گوشعرااور تاریخوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد کوتاریخوں کے معاملے میں خودکفیل بنادیا تھا۔ان کے مصنفین کی شہرت اورناموری کو دیکھتے ہوئے کچھ سرقہ بازوں نے ان فرہنگوں کی مدد سے نئی فرہنگیں بناڈالیں۔بیشتر الفاظ ان فرہنگوں سے حاصل کرکے اور چند الفاظ اپنی طرف سے شامل کرکے ایک نئی فرہنگ تیار کرلی جاتی۔وہ مصنفین جنھوں نے اپنی سالہا سال کی محنت سے حاصل شدہ سرمایہ کوعوام کے سامنے پیش کیا تھا اس میں جب نقب لگائی گئی توان مصنفین کو بہت دکھ پہنچا۔'ام التواریخ' شائع ہوئی تو اس سے مستفید مواد کے ذریعے کچھ لوگوں نے نئی فرہنگیں ترتیب دے لیں۔حسین علی فرحت کے صاحب زادے محبوب علی جودتؔ کا بیان ہے:''لیکن بعد میں چند صاحبوں نے اس میں سے الفاظ چن کر نئی کتاب بنالی ہیں۔''۴۰ 'ام التواریخ' دوبارہ شائع ہوئی تو سید محمود گرمی نے اس کی اشاعت کی تاریخ کہی۔اس کے چار شعر درج کیے جاتے ہیں جن سے مذکورہ بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔

مبارک ہو مژدہ یہ اہلِ ہنر کو　　مکمل ہوا فن تاریخ گوئی
کہ ام التواریخ چھپ کر دوبارہ　　ہوئی جلوہ پیرا بطرز نکوئی
زیادہ ہوئے اس میں الفاظ صدہا　　ہوئی چشم نقصان کی اب اشک شوئی
ہوا چشمہء فیض فرحت کا جاری　　کہ چشمِ امید آکے آنکھوں نے دھوئی ۴۱

مندرجہ بالا اشعار میں غالباً شاعر نے اس کتاب کی مزید الفاظ کے اضافوں کے ساتھ اشاعت کوچشم نقصان کی اشک شوئی سے تعبیر کیا ہے اوراس سے ان کی مراد یہی ہے کہ اب چونکہ فرہنگ میں سینکڑوں الفاظ مزید شامل ہوگئے ہیں تو یہ ایک نئی کتاب بھی بن گئی ہے۔اب اس کتاب کی اشاعت سابقہ کتابوں پر سبقت بھی لے جائے گی اوراس دوسری اشاعت سے سرقہ بازوں کی قلعی بھی کھل جائے گی۔تاریخی الفاظ کی فرہنگوں سے دوطرح کا استفادہ ہوا۔پہلی قسم کا استفادہ تو سرقے کے زمرے میں آتا ہے کہ مصنف سے اجازت لیے بغیر اور بنا حوالہ دیے فرہنگوں سے حاصل کردہ مواد کو اپنے نام سے منسوب کردینا غیر اخلاقی حرکت بھی تھی اور غیر قانونی عمل بھی۔اس عمل سے ان مصنفین کو سخت دکھ پہنچا جنھوں نے قطرہ قطرہ لفظوں کو جمع کرکے فرہنگ تیار کی تھی۔یہ فرہنگیں ایک دوسال میں تیار نہیں ہوئیں۔ان کی تیاری میں مرتب کرنے والوں عمریں صرف ہوئی تھیں۔انھوں نے جگرخون کرکے اور آنکھوں کا تیل ٹپکا کران فرہنگوں کومرتب کیا تھا لیکن دن دیہاڑے اور دیدہ ودانستہ کسی کی محنت کولوٹ لینا ڈاکہ زنی کے زمرے میں آتا ہے۔اسی ڈاکہ زنی نے مرتبوں کے دلوں کا خون بھی کیا۔'ام التواریخ' شائع ہوئی تو لوگوں نے اس کتاب سے بہت سا مواد لے کرنئی کتاب بنا کر شائع کردیا۔فرحت کے برخوردار محبوت علی جودت نے 'ام التواریخ' کے دیباچے میں اس بات کی نشان دہی کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اگر یہ کہا جاوے تو بے جانہوگا کہ اس جامع کتاب سے قبل کوئی رسالہ اس فن میں مروج نہ تھا لیکن بعد میں چند صاحبوں نے اس میں سے الفاظ چن کرنئی کتاب بنالی ہیں۔اس لیے دوسال محنت کرکے نئے نئے اعداد کے الفاظ

اور نکال کر اس میں شامل کیے گئے اور نیز وہ ضروری قواعد جو تاریخ گوئی کے متعلق زیادہ بکار آمد ہیں اس طبع ثانی میں بڑھا دیے گئے ہیں جس کے سبب سے یہ کتاب مکمل اور جامع فن تاریخ میں تیار ہوگئی ہے۔ اب تاریخ گویوں کے لیے یہ کتاب رہبر اور رہنما ہے۔''[۴۲]

آغاز آغاز میں جو فرہنگیں شائع ہوئیں ان سے بغیر اجازت لیے اور بغیر حوالہ دیے کئی فرہنگیں مرتب کر کے شائع کروا دی گئیں لیکن بعد کے مصنفین نے اپنی فرہنگوں کی تیاری اور استفادے کے حوالے سے اپنے مآخذ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ امیر مینائی نے فرہنگ تیار کی تو نہ صرف دوسری فرہنگوں سے استفادے کا اعتراف کیا بلکہ ان کے نام بھی درج کیے۔ ان کا بیان ہے۔'' سالہا سال سے وقتاً فوقتاً اس کی تکمیل و ترتیب میں سرگرم تھا مگر تعمیلات سرکاری و مشاغل زمانہ سے ایسی فرصت کافی نہ دستیاب ہوئی کہ اس محنت کو اتمام تک پہنچاتا'' بعد کے لکھنے والے فرہنگ نویسوں نے اردو کی اولین لغات سے استفادے کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً امیر مینائی 'حمائل تاریخ' کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''اسی اثنا میں ایک محقق عالی نظر سے معلوم ہوا کہ شیخ کرامت علی صاحب مرحوم اظہر تخلص کہ تاریخ گوئی میں بڑے مشاق تھے۔ انھوں نے بھی ایسی ہی ایک کتاب تالیف فرمائی ہے جس کا نام تحفۂ خاقانی ہے۔ ہنوز اس کی تلاش تھی کہ شیخ الٰہی بخش صاحب متخلص بہ شائق کی 'آئینہ تواریخ' اور لالہ رام پرشاد صاحب دہلوی کی 'کان تاریخ' چھپ کر نگاہ سے گذری۔ اب ہیچ میرز یہی بات مناسب سمجھا کہ ان تینوں کتابوں کو پیش نظر رکھ کر ہر عدد میں اپنے الفاظ مجوزہ بڑھائے اور الفاظ غیر مانوس وغیرہ مستعمل و کریہہ کو ترک کر کے عربی و فارسی جدا اور ہندی الفاظ جدا کر دیے اور اس مجموع کا نام 'حمائل تاریخ' ۱۳۰۰ھ رکھا۔''[۴۳]

میر مہدی حسین الم 'گلبن تاریخ' میں بھی جن فرہنگوں سے استفادہ کیا ان کا حوالہ دیا اور فرہنگ مرتب کرتے ہوئے جتنا عرصہ صرف ہوا اس کا حوالہ بھی دیا۔ لکھتے ہیں۔''

پانچ سال کے عرصہ میں اس فن کے جملہ کتب مطبوعہ یعنی ام التواریخ و آئینہ تواریخ و گنجینہ تواریخ و گلشن خیال و کان تاریخ و مساوی الاعداد بسعی و جستجوے کمال فراہم کیا اور قریب بیس ہزار لفظ عمدہ و بکار آمد اس میں اضافہ کر کے ایک ضخیم کتاب تیار کی۔ چونکہ اتمام تالیف و آغاز طبع ۱۳۱۳ھ میں منصۂ ظہور پر جلوہ آرا ہوا لہٰذا اس کتاب کو باسم تاریخی گلبن تاریخ ۱۳۱۳ھ موسوم کیا''[۴۴] قارئین اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب ایک فرہنگ کی تیاری میں بہت سی فرہنگوں سے انتخاب میں پانچ سال کا عرصہ صرف ہوا تو وہ لوگ جنھوں نے اولین فرہنگیں تیار کی ہوں گی۔ انھیں کتنا عرصہ لگا ہوگا۔

تاریخ گوئی کی فرہنگوں کے عام ہونے سے پہلے تاریخ گو شعرا کو اپنے کمالاتِ فن دکھانے کے مواقع ذرا کم ہی دستیاب ہوتے تھے کیونکہ کوئی نادر اور محیر العقول تاریخ کہنے کے لیے جس حسابی مشق اور ذہنی طباعی کی ضرورت ہوتی تھی اس کے معیار پر بہت کم تاریخ گو اترتے تھے۔ تاریخ گوئی کی فرہنگوں کی اشاعت کے بعد صورتِ حال ''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے'' کی سی پیش آ گئی تھی۔ اب ہر تاریخ گو کے لیے یہ مواقع موجود تھے کہ وہ

پورا زورِ طبع موضوع کی مناسبت سے تاریخ کہنے پر صرف کر سکے تا کہ خوبصورت، برمحل، رواں، برجستہ اور نادر تاریخیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو سکیں۔ مزید یہ کہ ان لغات کی مدد سے شاعر کے پاس اپنے شاعرانہ کمالات کے اظہار کے وسیع مواقع ہاتھ آ گئے تھے۔ اب ہر کہ دمہ تاریخ کہنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ ان فرہنگوں کی وجہ سے ایک طرف تاریخ گو شعرا کو اپنے کمالاتِ فن کے اظہار کے وسیع مواقع اور امکانات پیدا ہو گئے تھے تو دوسری طرف تن آسان شعرا کے لیے بھی تاریخ کہنے کی سہولت پیدا ہو گئی تھی کہ اب وہ لغت سے لفظ تلاش کریں اور انھیں جوڑ کر زبردستی کی ہی سہی تاریخ کہہ کر ذہنی تسکین کا سبب فراہم کر سکیں۔ ان لغات نے برصغیر میں بالخصوص اور شمالی ہند میں بالعموم تاریخ گوئی کا شوق عام کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ اسی بات کا ثبوت ہے کہ محدود عرصہ میں تاریخی الفاظ کی کئی فرہنگیں مرتب ہوئیں اور زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئیں جو عرصہ دراز تک ان کو دیکھنے سے محروم تھے۔

تاریخ گوئی کی فرہنگوں کی اشاعتوں نے معاشرے میں تاریخ گوئی کے شوق کو طبقۂ خواص سے طبقۂ عوام میں منتقل کرنے اور عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ شاہ راہِ خاص جو طبقۂ امرا یا اشرافیہ کے لیے مختص تھی ان فرہنگوں کی اشاعت نے اسے شاہراہِ عوام بنا کر ہر شخص کے لیے کھول دیا۔ اب اس صف میں محمود و ایاز، آقا و غلام، امیر و غریب، خاص و عام، چھوٹا بڑا، افسر ماتحت ایک ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ہر شخص ان فرہنگوں کے سہارے تاریخ کی فکر اور تلاشِ الفاظ و مادہ تاریخ میں مصروف رہنے لگا۔ اس طرح نو آموز تاریخ گو شعرا کے لیے بہت زیادہ سہولت پیدا ہو گئی۔ اب تاریخ گو کو ایک ایک لفظ کی تلاش میں دماغ سوزی نہیں کرنا پڑتی تھی اور فکرِ تاریخ میں سر کھپانا نہیں پڑتا تھا۔ جس عدد کے لفظ کی ضرورت پیش آتی اسے فرہنگ میں تلاش کر لیا جاتا۔ چونکہ ان فرہنگوں میں ایک عدد سے متعلق کئی کئی الفاظ موجود ہوتے تھے جن میں سے مطلوبہ لفظ کو تلاش کر کے تاریخ کے خانے میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ ہر عدد کے لیے کئی کئی متبادل الفاظ کی موجودگی سہولت کا باعث ہوتی تھی اور بہتر تاریخ کہنے میں مددگار کا کام بھی کرتی تھی۔ اس سہولت نے محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ امتیازات کے حائل پردے ہٹ چکے تھے۔ ان فرہنگوں نے تاریخ گوئی کی روایت میں وہی کردار ادا کیا جو ولی کے دیوان کی شمالی ہند آمد نے کیا تھا۔ ولی کے دیوان کی آمد کے بعد گھر گھر شاعری کا چرچا ہو گیا تھا۔ ان فرہنگوں کی اشاعت کے بعد گلی گلی تاریخ گوئی کا چرچا ہونے لگا۔ تاریخ گو شعرا کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ اب ہر شخص ان فرہنگوں کی مدد سے لفظوں کو جوڑ کر تاریخ تیار کر لیتا تھا۔ اس حوالے سے نثار علی شہرت کا بیان ہے۔ ''میرے والد ماجد خلد آشیان جناب منشی حسین علی صاحب فرحت دہلوی نے اس دقت کے رفع کرنے کے لیے ۱۲۸۹ھ میں یہ ضخیم کتاب تصنیف کی جس میں دو ہزار تک کے اعداد کے الفاظ بکثرت تحریر کیے ہیں گویا کہ تاریخ گویوں کے لیے عمدہ الفاظ کے اعداد کی ڈکشنری بنا دی جس کی مدد سے کم مشق بھی ایک گھنٹہ میں دس پندرہ تاریخیں عمدہ سے عمدہ لکھ سکتا ہے یعنی مادہ میں جتنے عدد کی کمی ہوئی اس کے الفاظ میں

دیکھ لیے پس بہت سے الفاظ میں ایک دو موزوں الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔ اُس کے ملنے پر عمدہ تاریخ بن جاتی ہے۔ میں مبالغہ کے ساتھ نہیں بلکہ انصاف کی رو سے عرض کرتا ہوں کہ اس فن پر ام التواریخ ۱۲۸۹ھ کی وجہ سے چار چاند لگ گئے ہیں اور ہر ایک مؤرخ اور شاعر کو عمدہ تاریخ نکالنے کی جرات ہوگئی۔ چنانچہ جب سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ فن تاریخ گوئی میں جان پڑ گئی ہے۔ ہر شخص عمدہ تاریخ لکھنے لگا ہے۔ یہ میرے قبلہ گاہی جنت پناہی کا احسان تمام ملک پر ہے جن کو تا قیامت اس فن کے جاننے والے نہ بھولیں گے۔'' ۴۵

'ام التواریخ' کا سرِ ورق دیکھیے۔ اس میں بھی تاریخ گو شعرا کی سہولت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ 'اُم التواریخ ۱۲۸۹ھ مصنفہ ء فاضل اجل شاعر بے بدل منشی حسین علی فرحت دہلوی مرحوم ومغفور، حسب الارشاد عالی جناب اخی معظم ومکرم ناظم فصاحت ناثر بلاغت، جناب منشی نثار علی صاحب شہرت سابق ڈائریکٹر سررشتہ ء تعلیم ریاست جموں وکشمیر، خاکسار ازلی بندہ ء محبوب علی جودت (خلف الرشید حضرت مصنف [نثار علی شہرت]) نے واسطے سہولت تاریخ گویوں اور شعرا کے اپنے مطبع قاسمی میرٹھ میں طبع کرائی۔''

تاریخی الفاظ کی یہ فرہنگیں اس عہد کے شعرا کے دلوں کی آواز تھی۔ کسی کے لیے یہ ہادیِ تاریخ تھی تو کسی کے لیے رہبر و رہنما، کسی نے اسے خضرِ راہِ تاریخ کہا تو کسی نے کانِ تاریخ، کسی نے اسے آلہ ء تاریخ کہا تو کسی نے کفیلِ تاریخ ۴۶ غرض اس عہد کے افراد نے ان فرہنگوں کو کئی نام سے پکارا۔ ان سب ناموں کے پس منظر اس عہد کے شعرا کے خیالات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ میر محمد حسین فاضل برادر الم کی تاریخ کے اشعار ہیں:

کیا خوب ہوئی کتاب یہ طبع — بہر شعرا کفیل تاریخ
فاضل مرے بھائی نے لکھی یہ وہ کتاب — جس سے آسان ہوا ہے کہنا تاریخ ۴۷

شیخ عزیز الدین عزیز کے اشعار ملاحظہ فرمایئے:

پئے تسہیل ناظم و شعرا — لفظ شائق نے ایسے جمع کیے
مبتدی بھی مدد سے جن کی اب — جیسی تاریخ چاہے خود کہہ لے ۴۸

منشی بالک رام گہر کاپی نویس مقیم کانپور کا قطعہ ء تاریخ ہے:

مرحبا صد مرحبا ہے فکر شائق کو گہر — ختم اس پر بے گمان عالی دماغی ہو گئی
چھپ چکا ہے اس کا پہلے ایک دیوان لاجواب — اب لکھی ہے اک کتاب اس نے فن تاریخ کی
لفظ وہ ہیں درج جو ہیں عام استعمال میں — غیر مانوس اور بھرتی سے بری ہے واقعی
بے تکلف میں بھی اس کے وصف میں لکھتا ہوں یہ — مشکل تاریخ گوئی کیسی ہے آسان کی ۴۹

۱۸۹۴ء

منشی محمد مبین جلیس کا شعر دیکھیے:

کیونکر نہ اس کی مدح کریں صاحبِ کمال — آسان کر دیا فنِ تاریخ اے جلیس ۵۰

تاریخ گوشعرا کے لیے زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی تھی جب کسی عدد کی کمی بیشی ہو جاتی تھی۔ ایسے عالم میں یہ فرہنگیں بہت بڑی مددگار کے طور پر کام آتی تھیں۔ تعمیہ یا تخرجہ کے لیے بھی یہ لغات سہولت بہم پہنچاتی تھیں۔ سید باقر کاشفؔ کے درج ذیل اشعار دیکھیے:

کمی بیشی ہو گر کچھ مادّے میں تو فوراً دیکھ لو اس میں قسم ہے
اُسی تعداد کا اک لفظ مطلوب نکل آتا ہے جو دراصل کم ہے [۵۱]

انیسویں صدی کا عہد تاریخ گوئی کا سنہری دور تھا۔ اس صدی کے ادبی آسمان پر تاریخ گوئی کے گھنے بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس عہد کو ختم کر کے رکھ دیا۔ آج ہمارے پاس اس دور کی فقط نشانیاں ہی باقی ہیں۔ زندہ قومیں اپنی نشانیوں اور یادگاروں کو محفوظ رکھنے کی مقدور بھر کوششیں کرتی رہتی ہیں کیونکہ یہ ان کی شناخت بھی ہوتی ہے اور وراثت بھی۔ اسلاف سے حاصل کردہ امانتوں کو بحفاظت اگلی نسلوں تک منتقل کرنا ہر قوم کا فرض بھی ہے اور ضرورت بھی۔ یہ ان کا ماضی ہوتا ہے جس کے سہارے وہ حال میں داخل ہوتے ہیں اور یہی حال ان کے مستقبل کا تعین کرتا ہے اور رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیتا ہے۔ ہم اپنے ماضی کو فراموش کر چکے ہیں اور اپنے مستقبل سے بھی بے نیاز نظر آتے ہیں۔ رہ گیا حال، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ اگر صورت حال یہی رہی تو یہ فن بھی قصہء پارینہ بن کر رہ جائے گا۔ اس سے پہلے کہ یہ فن تاریخ کے صفحات اور ہمارے یادداشتوں سے محو ہو کر رہ جائے، ہم پر اپنے حصے کا کفارہ ادا کرنا لازم ہے۔

حواشی وحوالہ جات:

۱ تاریخ گوشعرا اور اساتذہ کے درمیان تائے موقوفہ اور تائے مربوطہ کے حوالے سے اختلاف ہے۔ منشی محمد انوار حسین تسلیم سہسوانی نے اپنی تصنیف 'ملخص تسلیم' میں اس حوالے سے کافی بحث کی ہے۔ آخر میں لکھا ہے ''حتیٰ کہ مولوی امام بخش صہبائی مدرس فارسی مدرسہ شاہجہان آباد سے دریافت کیا۔ مولوی امام بخش نے جو جواب مجھے لکھا ہے وہ یہاں حرف بحرف لکھا جاتا ہے اور یہ خط ان کی انشاء مطبوعہ میں موجود ہے'' یہ عبارت لکھنے کے بعد ان کا خط نقل کیا ہے جس میں تائے مربوطہ اور تائے موقوفہ کے حوالے سے ان کا مؤقف سامنے آتا ہے۔ (دیکھیے :ملھم تاریخ ترجمہ ملخص تسلیم مصنفہ انوار حسین تسلیم مترجم سید اقتدار احمد ساحر سہسوانی، مطبع مطلع العلوم مراد آباد، ۱۹۱۲ء، ص ۴۶۔۴۱) مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی طرح کا ایک خط غالب کو بھی لکھا گیا تھا جس میں تاریخ گوئی کے مسائل کے حوالے سے ان سے استفسار کیا گیا تھا لیکن فی الوقت اس کا ماخذ ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ اس لیے پوری تفصیل لکھنے سے قاصر ہوں۔ (ابرار)

۲ آثار الشعرا، مولوی ممتاز علی، مطبع شاہ جہانی، بھوپال، ۱۳۰۶ھ ص ۱۶۵

۳ دیوانِ حالی، الطاف حسین حالی، نامی پریس، کانپور، ۱۸۹۳ء ص ۲۰۔۳۱۹

۴ آب حیات، محمد حسین آزاد، مرتبہ ابرار عبدالسلام، شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۶ء ص ۵۳

۵ خاتمہ تذکرہ مالک الدولہ صولت مشمولہ ادیب، الہ آباد ۱۹۱۳ء۔۱۹۱۰ء، پہلی جلد خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۰ء ص ۴۷۔۴۶

۶ غالب لکھتے ہیں: ''میں تاریخ کو دوں مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمھاری طرح میرا یہ بھی عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حقِ محبت ہو جاتا ہے۔'' (غالب، غلام رسول مہر ص ۳۶۰) نواب علاء الدین احمد خان علائی نے بیٹے کی پیدائش پر تاریخ کی فرمائش کی تو ان کا جی گھبرایا اور انھوں نے اس بے گار سے بچنے کے لیے یہ عذر پیش کر دیا۔ ''شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریقِ صید افگنی سکھلاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ نکالو کہ مجھ پیرِ غم زدہ، دلِ مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین خان! تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسمِ تاریخی نظم کر دیا اور لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے۔ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے جا پہنچا۔ صاحب، دہائی خدا کی! میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا نہ نامِ تاریخی ڈھونڈوں گا۔ (خطوطِ غالب جلد اول ص ۳۲۳)

۷ غالب از غلام رسول مہر، کوہِ نور پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۴۴ء، بار سوم ص ۳۶۰

۸ دیوانِ حالی، ص ۲۰۔۳۱۹

۹ دیکھیے :خم خانہ ء جاوید، جلدسوم، لالہ سری رام، دلی پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۷۱ء ص ۱۱۳

۱۰ انشائے داغ، مرتبہ سید علی احسن مارہروی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۴۱ء ص ۸۹

۱۱ ایضاً

۱۲ ریاض معلی، حاجی محمد مظفرالدین صدیقی معلیٰ حیدرآبادی، عمار پریس چھتہ بازار، حیدرآباد، ۱۳۴۰ھ ص ۸۲

۱۳ چمن بے نظیر، مرتبہ محمد احمد علی، مطبع مجیدی، کانپور، ۱۳۲۸ھ ص ۳۵۳

۱۴ تذکرہ کاملان رامپور، حافظ احمد علی شوق، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء ص ۴۰۶-۴۰۵

۱۵ کلیات منیر، سید اسمٰعیل حسین منیر، مطبع ثمر ہند لکھنؤ، ۱۸۷۹ء ص ۵۳۷

۱۶ دیوان صد غزل، حسین علی تاسف، مرتبہ ڈاکٹر شبیہ الحسن، نظامی پریس، کانپور، ۱۹۷۳ء ص ۲۳۹

۱۷ بہارِ بے خزاں، احمد حسین سحر مرتبہ نعیم احمد، سلسلہ مطبوعات علمی مجلس، دہلی (۱۷) ۱۹۶۸ء ص

۱۸ ناسخ تجزیہ و تقدیر، ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی، یونائٹڈ پریس لکھنؤ، ۱۹۷۴ء ص ۲۱۶-۱۷

۱۹ آئینہء تواریخ، حافظ الٰہی بخش شائق، انتظامی پریس، کانپور، ۱۸۸۹ء ص ۱۰-۹

۲۰ دیباچہ ام التواریخ محمد حسین علی فرحت، دہلی پنچ پریس، لاہور، ۱۸۷۲ء ص ۳

۲۱ تاریخ گوئی کا فن، میر نثار علی شہرت، مخزن، جولائی ۱۹۱۶ء ص ۳۱

۲۲ موجد التواریخ، حسین علی فرحت، شگوفہ پریس میرٹھ، ۱۸۸۵ء ص ۳۲

۲۳ ام التواریخ ص ۲

۲۴ ایضاً ص ۴۲۲

۲۵ فنِ تاریخ گوئی، حامد حسن قادری، زمانہ کانپور نومبر ۱۹۲۶ء ص ۲۶۰۔ اگرچہ ان کا یہ بیان بیسویں صدی کے اوائل کا ہے لیکن ان کے اس بیان سے تاریخ گوئی کی مشکلات سمجھنے میں مدو ملتی ہے۔

۲۶ ام التواریخ، ص ۱

۲۷ آئینہء تواریخ، ص ۱۰-۹

۲۸ موجد التواریخ ص ۳۱

۲۹ نثار علی شہرت لکھتے ہیں: ''زیرک ودانا تاریخی نام کی تلاش میں مصروف ومتلاشی رہتے ہیں اور جس کا نام تاریخی ملجاوے اس کو تائید غیبی کہتے ہیں (دیباچہ موجد التواریخ ص ۲) حسین علی فرحت ہی کا بیان ہے ''پہلے سروشِ غیبی کا انتظار رہتا تھا۔ عمدہ مادہ نہ میسر آنے سے شاعر کا دل فگار رہتا تھا اور اب اس کتاب کی مدد سے جس قدر مادّے چاہیں گے بہم پہونچائیں گے۔ (دیباچہ ام التواریخ از حسین علی فرحت ص ۱) محبوب علی جووت کا بیان ہے: ''ایک زمانہ وہ تھا کہ اس قسم کے الفاظ ہاتھ لگ جانے یا ذہن میں آجانے کو سروش غیب یا ہاتف غیبی سے تعبیر کیا کرتے تھے اور کئی کئی دن کسی تاریخ کا مادہ نکالنے میں صرف

ہوجاتے تھے۔(ام التواریخ ص۴۲۱)

۳۰ تاریخ گوئی کا فن از نثار علی شہرت ص۳۱

۳۱ ایضاً ص۳۱

۳۲ ایضاً

۳۳ ایضاً

۳۴ آئینہء شائق ص۱۲

۳۵ ام التواریخ ص۳

۳۶ ایضاً

۳۷ کانِ تاریخ، منشی رام پرشاد دہلوی، مطبع انوری، آگرہ، ۱۲۹۴ھ، ص۱۵۷

۳۸ ام التواریخ ص۴۲۴

۳۹ آئینہء شائق ص۱۲

۴۰ ام التواریخ ص۳

۴۱ ام التواریخ ص۴۲۴

۴۲ ام التواریخ ص۳

۴۳ حمائل تاریخ، امیر مینائی، ۱۳۰۰ھ قلمی مسودہ مملوکہ اسرائیل احمد مینائی، عکسی نقل مملوکہ راقم الحروف

۴۴ گلبن تاریخ، میر مہدی حسین رضوی الم، مطبع فخر نظامی، حیدر آباد دکن، ۱۳۱۳ھ، ص۳

۴۵ ام التواریخ ص۲

۴۶ تاریخ گو شعرا نے لغات کی تاریخیں کہیں تو انھیں یہ نام دیے۔ سنہ طبع۔ کانِ تاریخ گوئی (ام التواریخ ص۴۲۴) کہا ہے آلہء تاریخ گوئی ۱۲۸۹ھ (ام التواریخ ص۴۲۲) بہر شعرا کفیل تاریخ (گلبن تاریخ ۶۸۴)

۴۷ گلبن تاریخ ۶۸۴

۴۸ آئینہء شائق ص۱۳

۴۹ آئینہء شائق ص۱۵

۵۰ آئینہء شائق ص۷

۵۱ گلبن تاریخ ۶۸۴